''یہ جہاد'': روشن خیالی، مزاحمت اور مابعد جدید فکشن کی مثال

ڈاکٹر قاضی عابد، استاد شعبۂ اُردو، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان
ڈاکٹر روبینہ رفیق، استاد شعبۂ اُردو و اقبالیات، اسلامیہ یونیورسٹی، بہاولپور

Abstract

This article tries to analyze a novel written about so called Jehad in the context of post modern literature theory. It discusses how the conflict between USSR and USA named as cold war destroyed Afghanistan and effected Pakistan.

پاکستان، افغانستان کی دونوں جنگوں میں برابر کا ساجھے دار رہا ہے مگر یہاں کا فکشن نگار افغانستان کی ان جنگوں کے اس خطّے پر مرتب ہونے والے اثرات کا تنقیدی یا تجزیاتی مطالعہ اور تخلیقی اظہار کرتا ہوا کیوں دکھائی نہیں دیتا۔ ۱۹۷۹ء میں افغانستان میں رُوسی در اندازی اور اس کی مزاحمت امریکی ڈالروں سے کرنے والے نام نہاد مجاہدین، ڈرگ کلچر، کلاشنکوف کلچر، پاکستان میں افغانستان بستیاں اور پھر افغانوں کے اس سوسائٹی پر اثرات یمنی، چیچنی، عراقی، سعودی اور دنیا کے دیگر خطوں سے طرح طرح کے مسلمانوں کا پاکستان آنا اور جہاد کے نام پر اس معاشرے کی ذہنی اور نفسیاتی کایا کلپ وغیرہ کیوں ہماری ادبی تہذیب کا موضوع نہیں بنا۔ ہوا تو صرف اتنا کہ اسلامی ادب کی نام نہاد تحریک کے لکھاریوں نے فیض اور دیگر ترقی پسندوں کو طعنے دیئے کہ اب آپ لوگ روس کی مخالفت میں کوئی مزاحمتی ادب کیوں تخلیق نہیں کرتے۔ یہ بات اگرچہ ماننے والی ہے کہ ہمارے اس دور کے چند لکھنے والوں اور خاص طور پر افسانہ نگاروں نے ''ضیاع الحق'' کے مارشل لاء کی مزاحمت کی اور اس دورِ ضیاع کا آشوب اپنی تحریروں میں واضح کیا لیکن افغانستان کی مقدس امریکی جنگ نے اس معاشرے پر اپنا کیا نقش ترتیب دیا اس پر ہمارے تخلیق کار نے کچھ نہیں لکھا۔ شاید یہ ایک پیچیدہ تجربہ تھا اور اس کی پُشت پر پاکستان کی نام نہاد مذہبی اشرافیہ، خاکی اور غیر خاکی نوکر شاہی، عرب ملکوں کا پروپیگنڈا، امریکی سی آئی اے اور دیگر دیکھے ان دیکھے ہاتھ موجود تھے۔ لیکن تخلیق کار تو ان سب پردوں میں مستور حقیقت تک پہنچ جاتا ہے تو پھر یہ سب کچھ ہمارے فکشن لکھنے والوں کی ذہنی اور تخلیقی واردات کیوں نہ بنا، اس سوال کا جواب ہم لوگوں کے ناخن پر قرض ہے۔

۱۹۷۹ء میں افغانستان میں رُوس کی آمد دراصل اس سرد جنگ کا نقطۂ عرُوج اور فیصلہ کُن موڑ تھا جو دوسری عالمی جنگ کے اختتام پر امریکہ اور رُوس کے درمیان شروع ہوئی تھی اور جس نے دنیا کو تین حصّوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ سرمایہ دار، اشتمالی اور بے حد و حساب غریب تیسری دنیا۔۔۔۔ دس برس بعد رُوس کی واپسی اس طور ہوئی کہ دنیا

کی اس تقسیم پر خطِ تنسیخ پھر گیا۔ تاریخ کی موت واقع ہوگئی (فرانسس فوکویاما)(۱) اور دنیا یک قطبی ہوگئی۔

خودکش حملوں کی اصل کہانی اسی یک قطبی دنیا سے شروع ہوئی۔ اگرچہ ٹیری ایگلٹن (۲) (مقدّس دہشت گردی) اس کا سراغ یونانی رزمیوں اور المیوں (ٹریجڈیز) میں بھی تلاش کر لیتے ہیں لیکن چلیں اپنی معلوم دنیا سے ہی بات شروع کریں تو اس کے اصل اسباب کا تعیّن کرتے ہوئے اور امریکہ اور اس کے اتحادیوں کے ظلم وستم کا اعتراف کرتے ہوئے بھی اس عمل کی توصیف، حمایت یا تحسین کسی بھی طور ممکن نہیں ہوسکتی مگر صورتحال کا درست تجزیہ بہرحال ضروری ہے کہ جدید دنیا جسے اس قدر ترقی کے بعد اور علم کے روز افزوں اضافے کے بعد جس طرح سے پر امن ہونا چاہیے تھا، ویسے کیوں نہیں ہے۔

امتل منان طاہر کا یہ ناول بنیادی طور پر اسی گہرے سوال کا تخلیقی اظہار ہے اور اس سوال کے جو جواب مختلف اطراف میں بکھرے ہوئے ہیں ان کا معروضی تجزیہ کرتا ہے۔ ناول کا موضوع کیا ہے، بظاہر تو اسے دو ہی لفظوں میں بیان کیا جا سکتا ہے: یہ جہاد، خودکُش حملے۔ لیکن بات اس قدر سادہ نہیں ہے۔ اگر سادہ بات ہوتی تو اس حوالے سے مقبول عام یا عوام ادب تخلیق کرنے والے طارق اسماعیل ساگر، رضیہ بٹ یا ان کے جد امجد نسیم حجازی میں کوئی فرق نہ ہوتا۔ یہ ایک مابعد جدید ناول ہے، اس لئے اس کا بیانیہ تکثیریت کا حامل ہے اور ویسے بھی اس موضوع پر لکھتے ہوئے غیر تکثیری بیانیہ تخلیق کرنے کا مطلب اپنے تخلیقی عمل اور اس میں بنی گئی حقیقت کو محدود اور یک طرفہ یا یک سمتہ کرنا ہے۔ اُردو میں اگرچہ کبیر بیانیہ اور صغیر بیانیہ کی روایت نئی نہیں ہے اور بعض اوقات تو صغیر بیانیہ (غزل) کے اندر بھی تکثیریت اس طرح جلوہ گر ہوتی ہے کہ وہ صغیر صورت بیانیہ خود کبیر بیانیہ کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ مابعد جدید ناقدین جانتے ہیں کہ اس کے نظریہ سازوں نے جس کبیر بیانیے کو پسند نہیں کیا اور اس کی مخالفت کی ہے وہ کبیر بیانیے کیا ہیں اور ان کی نوعیت کیا ہے۔ ناول اپنی تکثیریت (سب سے اعلیٰ مثال: آگ کا دریا) کی وجہ سے کبیر بیانیہ ہی ہوتا ہے جس میں معنی کی کھلی اطراف ایک طرح کی اجتماعیت پیدا کرنے میں مدد دیتی ہیں۔ غزل اور افسانہ بے شک صغیر بیانیے ہیں لیکن یہ بھی اپنی حدود اور دوائر کے اندر کثرتِ معنی کے حامل ہو سکتے ہیں اور ہوتے ہیں۔ مابعد جدید تنقید اب اس طرح سے موضوع کی وحدانی تعین بھی نہیں کرتی جیسے ایک زمانے میں اس کا عام چلن تھا۔ اس ناول کی پیچیدہ تخلیقی بنت بھی اسی طرح ہوئی ہے۔ یہ خودکش حملوں کی کتھا کہانی سناتے ہوئے بھی دیگر بہت سے امور کو ہمارے سامنے لاتا ہے۔

ناول کی کہانی خودکش حملوں، طالب اور صوفیہ کے گرد گھومتے ہوئے جن الحاقی موضوعات کو اپنی بنت میں شامل کرتی ہے ان میں ایک نئے جنم لینے والے مخلوط معاشرے میں فریقین کے مسائل، پاکستانی/ ہندوستانی Diaspora، جڑوں سے کٹنے کا عمل، نئے معاشرے میں اقلیت (مذہبی حوالے سے نہیں بلکہ دیگر جدید اور تہذیبی حوالوں سے) ہونے کا احساس اور اس کی وجہ سے ایک نئی طرز کے Diaspora کا جنم اور نسلی خصائص جیسے حسّاس مسائل شامل ہیں۔

کہانی کا بنیادی محور وہی ہے جو آج کا سب سے بڑا انتزاعی مسئلہ ہے یعنی خودکش حملے جسے مصنفہ نے کمال جرأت اور بیباکی سے جدید دنیا کے اس نئے یا ٹیری ایگلٹن کے لفظوں میں قدیم کے نئے پن کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ یقینی طور پر افغانستان کو دو مرتبہ ایک ایسا میدانِ جنگ بننا پڑا جس میں اس کی حیثیت محض تیسرے فریق کی تھی اور پاکستان کو بھی دو مرتبہ اس جنگ کا فریق بننا پڑا۔ چوتھا فریق، ۔لیکن اثرات کے لحاظ سے اسے تیسرے فریق سے بھی بدتر صورت حال کا سامنا کرنا پڑا۔ ان دو جنگوں نے جس میں سے ایک پچھلی صدی میں اختتام پذیر ہوئی اور ایک کا فیصلہ شاید ہو چکا ہے مگر جس کا اعلان ہونا باقی ہے، پاکستانی معاشرے پر بے حد منفی اثرات مرتب کئے۔ یہ تو درست ہے کہ افغانستان اور پاکستان کے کچھ حلقے اور طبقے ان جنگوں میں خوب مالا مال ہوئے لیکن دونوں معاشرے بے حد ذہنی، مالی اور اخلاقی افلاس کا شکار ہوئے۔ یہ دونوں توام جنگیں ہیں اور دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کر کے بھی نہیں دیکھا جا سکتا۔ ایک جنگ میں مجاہدین پیدا کئے گئے (دیکھئے: دی وار آف چارلی ولسن) اور دوسری جنگ میں اسی مقدس جہاد کو بدی کا محور قرار دیا گیا۔ پہلی جنگ میں امریکہ اسلام کی جنگ لڑ رہا تھا جبکہ اب وہ شیطانِ عظیم ہو گیا ہے۔ اسی طرح ان دونوں جنگوں کے اثرات کو بھی ایک دوسرے سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ یہ وہی مجاہدین ہیں جنہیں امریکہ نے اس زعم میں نفسیاتی طور پر مبتلا کیا تھا کہ وہ ساری دنیا پر حکمرانی کر سکتے ہیں۔ شاید ضیاء الحق کی تذلیل بھری موت میں ان لوگوں کے لئے ایک پیغام تھا لیکن جسے نہ تو پورے عالمِ اسلام سے جمع ہونے والے نوری سمجھ سکے اور نہ اسلام آباد کے خاکی۔ کام ختم تو ملازمت بھی ختم۔ مگر اہم بات یہ ہے کہ اس اساطیری حقیقت کو جسے بعد میں ہر اساطیری حقیقت کی طرح ایک عصری حقیقت میں ڈھلنا تھا، نئی یک قطبی دنیا کے سیاہ وسفید کے مالک بھی نہ سمجھ سکے کہ عفریت کا پیدا کرنا بہت آسان ہوتا ہے لیکن ایک وقت ایسا آتا ہے جب عفریت کو کوئی اور ہدف نظر نہیں آتا تو وہ اپنے خالق پر ہی حملہ کرتا ہے۔ اس ناول کو پڑھنے سے پیشتر شاید یہ کہنا بہت آسان تھا کہ امریکہ کے ریاستی سرکاری دانشور سیموئیل۔ پی۔ ہنٹنگٹن (۳) کا یہ کہنا کہ اب دنیا میں نئی لڑائی تہذیبی معاملات پر ہو گی محض اس کے ذہن کی اختراع ہے مگر اب صورتحال کچھ اور طرح سے غور وفکر کی دعوت دیتی ہے۔ نام نہاد مجاہدین (طالبان) (۴) کی ذہنی ساخت (سافٹ ویئر) کی تخلیق ہنٹنگٹن جیسے ریاستی دانشوروں نے ہی کی تھی اور انہیں بخوبی علم تھا کہ یہ ذہنی ساخت بالآخر افغانستان میں مطلوبہ نتائج حاصل کرنے کے بعد کیا رُخ اختیار کرے گی۔ اس لئے انہوں نے اس کے توڑ کے طور پر ایک نئی وضع کی نظریہ سازی پہلے سے ہی کر رکھی تھی۔ اپنے پیدا کردہ عفریتوں سے مقابلے کے لئے تہذیبی آویزش کے قدیم نو آبادیاتی تعقلی نظام کو از سرِ نو دریافت کیا گیا۔ عفریت نے بھی ایک رنگ روپ اختیار کر لیا۔ وہ ذہنی ساخت اور وضع جو ان ریاستی دانشوروں نے تیار کی تھی اب ان کے خلاف استعمال ہونے لگی اور یوں 9/11 کے بعد افغانستان میں ایک نئی جنگ شروع ہوئی اور یہ پہلی جنگ کی نسبت زیادہ خوفناک اور اپنے اثرات کے لحاظ سے افغانستان اور پاکستان دونوں ملکوں کی معاشرتی ساخت کے لیے بے حد تباہ کُن ثابت ہوئی۔ خودکُش حملے انہی عفریتوں کی طرف سے جو آج پاکستان میں میڈیا کے ایک بہت بڑے حصّے کی

ہمدردیوں کے حامل ہیں اور پاکستان کی مذہبی سیاسی جماعتوں کی تقریباً مکمل حمایت رکھتے ہیں، پاکستان کے سماج کے لئے ایک نیا مہلک تحفہ ہیں۔ ایک مذہبی جماعت کے امیر کھلم کھلا ان کی حمایت کرتے ہیں جبکہ ایک دوسری جماعت سے تعلّق رکھنے والے اکثر لوگ ان کے حمایتی ہیں۔ دوسری جماعت سے تعلّق رکھنے والے ایک مدرسّے کی طرف سے شائع ہونے والے ایک رسالے الشریعہ میں یہ دلچسپ بحث موجود ہے کہ یہ خودکش حملے جائز ہیں یا نہیں تو ایک نام نہاد جید عالم نے نہ صرف ان کے جائز ہونے کی بات کی بلکہ اس کا تعلّق اسلام کی اس تاریخ سے جوڑنے کی بھی کوشش کی جسے نسیم حجازی جیسے ناول نگاروں نے اپنے تخیّل کی مدد سے وضع construct) کیا ہے اور جو مشتاق احمد یوسفی کے لفظوں میں محض ماضی تمنّائی ہی کی ایک شکل ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ پاکستان میں اسلام کے نام پر بڑے سے بڑے جھوٹ کو بھی شہادتِ عظمیٰ کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے۔ ہمارا معاشرہ ایک ایسا معاشرہ بن چکا ہے جہاں ظالم اور مظلوم کا فرق اس طرح مٹا ہے کہ ظالم مظلوم کی ہی صورت میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ دوسری بات یہ بھی ہے کہ دنیا کے دیگر بہت سے ممالک کی طرح ہمارا عام آدمی بیک وقت امریکہ کو مغلظات سے بھی نوازتا ہے اور گرین کارڈ کا خواہاں بھی رہتا ہے۔ ہمارے رگ وپے میں سرایت کر جانے والی اس منافقت کا تجزیہ ہمارے بہت سارے مسائل کا حل تلاش کر سکتا ہے۔

''ساری چوٹیاں ڈھلتے ہوئے سورج کی شعاؤں میں سنہری ہوگئی تھیں۔ صوفیہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی پتھر تک پہنچی اور اس پر بیٹھ کر اپنی نظریں ڈھلتے ہوئے سورج پر جما دیں۔ طالب بھی اس کے پیچھے پیچھے اسی پتھر تک پہنچ گیا۔ صوفیہ کو طالب کی وہاں موجودگی کا احساس نہیں ہوا۔ سورج آہستہ آہستہ دور پہاڑی کے پیچھے گم ہوتا جا رہا تھا اور صوفیہ اس منظر میں گم ہو چکی تھی کہ اس کو اپنے کانوں میں طالب کی آواز جیسے دور سے آتی ہوئی سنائی دی۔

''صوفیہ میں اس ڈھلتے ہوئے سورج کو گواہ بنا کر تم کو یقین دلاتا ہوں کہ کل جس طرح یہی سورج طلوع ہو کر پوری آب وتاب سے چمکے گا، میری محبت بھی اسی طرح ہر گزرے روز سے بڑھ کر ہوگی۔ میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں اور اپنی بقیہ زندگی تمہارے ساتھ گزارنا چاہتا ہوں۔ میں زندگی میں تمہیں کبھی مایوس نہیں کروں گا۔ میں ہمیشہ تمہارا رہوں گا، میری محبت کو قبول کر لو!'' (ص ۱۳۵)

ناول کے تکثیری متن میں مخلوط معاشرے (مذہبی، سماجی، تہذیبی ہر لحاظ سے) میں جنم لینے والے مسائل بھی نشان زد کئے جا سکتے ہیں۔ کسی بھی جدید معاشرے کے اندر جب کسی بھی نسبتاً کم جدید معاشروں کے لوگ آباد ہوتے ہیں تو انہیں کئی طرح کے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔:

الف) جدید مغربی معاشروں کے رہن سہن کی سہولتوں کو تو قبول کرنا لیکن وہ معاشرے جن اخلاقی اصولوں پر قائم ہیں، انہیں اپنے اخلاقی معیاروں سے پرکھنے اور بعد ازاں بدلنے کی خواہش رکھنا۔ ایک اقلیت (مذہبی، سماجی اور تہذیبی) کے طور پر ان پناہ دینے والے معاشروں کی اخلاقی اقدار کا احترام واجب ہوتا ہے۔ وقتی طور پر یا ضرورت کے طور پر یا کسی جذباتی حادثے کے نتائج کے طور پر ایک وقت میں تو ان باتوں کو قبول کر لیا جاتا ہے اور خاص طور پر جذباتی صورتحال میں ان باتوں کو نظر انداز کرنا مشکل نہیں ہوتا مگر

وقت کے گزران کے ساتھ یہ تضادات یا تفاوات ایک خاص وضع کے ذہنی خلجان اور نتیجتاً ایک پچھتاوے کا باعث بنتے ہیں۔ اس متن کے اندر صوفیہ کے والدین (حمید اور سارا) کا تعلّق بھی اسی نوعیت کا ہے۔ یہ ایک بہت بڑے مسئلے کی صورت میں ناول میں اس طور پر موجود ہے کہ صوفیہ کی زندگی کے بہت سے واقعات اور اس کی ذہنی پرداخت کا گہرا تعلّق اس صورتحال کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ اس کا ایک مخلوط مذہب والے گھر میں پیدا ہونے کے باوجود ایک مسلمان بچی کے طور پر پرورش پانا، اپنے والد کے ساتھ محبت، دادی اور دیگر اہلِ خانہ جو پاکستان میں ہیں ان سے رابطے میں رہنا، طالب سے متاثر ہو جانا اور شادی جیسا بڑا فیصلہ کر لینا ایسی ذہنی ساختیں ہیں کہ جن کی وضعیت میں اس کے والدین کا باہمی تعلّق ایک اہم اور فیصلہ کُن کردار ادا کر رہا ہے۔

ب) جڑوں کی تلاش اور Diaspora اس متن کی ہر ساخت کا اٹوٹ حصّہ ہیں۔ یہ ایک اور وضع میں سارا اور اس کے پرانے دوست کے حوالے سے بھی موجود ہے۔ محبتوں کی سرزمین کے اجڑے ہوئے باسی بھی ایک Diaspora میں رہتے ہیں۔ مابعد جدیدیت کو اس انسانی صورتحال کا جائزہ بھی لینا چاہیئے۔ حمید کے اندر بھی یہ مسئلہ بہت پیچیدہ شکل میں موجود ہے۔ اس کا پشاور جا کر سارا سے شادی کرنا، اپنے ہم وطن (پاکستانی) ہم سائے (یوسف خان) کو آسودہ زندگی گزارتے دیکھ کر خود رحمی کی طرز یا قماش کے قریب قریب رہنا، صوفیہ کو پاکستان میں دادی اور دیگر رشتہ داروں سے ملنے جانے کی حوصلہ افزائی کرتے رہنا، طالب کے ساتھ صوفیہ کے شادی کے مسئلے پر بغیر سوچے سمجھے اجازت دے دینا وغیرہ اس ضمن کی ہی مثالیں ہیں۔ پھر طالب کے کردار کے اندر بھی افغان Diaspora کی جڑیں پیوست ہیں جو رفتہ رفتہ اس کو طالب نام رکھنے والے ایک آدمی سے طالبان کے گروہ کی طرف دھکیل رہی ہیں۔ وہ کم فہم آدمی جو ہر مغربی ملک کو امریکہ کا اتحادی یا مماثل یا ساتھی سمجھتا ہے وہاں پر خودکش حملے کے لئے تیّار ہو جاتا ہے۔ صوفیہ کا پاکستان آنا اور اپنے رشتہ داروں کے ساتھ بے حد خوش رہنا، پاکستان کی تہذیب کے ساتھ اپنے آپ کو جوڑ کر دیکھنا، عمرہ کے لئے چل پڑنا یہ سب ایک بڑے دائرے میں Diaspora ہی کی مثالیں ہیں۔

ج) نسلی یا قبائلی خصائص بھی حاشیے میں درج ایسی وضعیں ہیں جو اس ناول کے تکثیری مزاج کی بافت میں مکمل طور پر پیوست ہیں۔ اگرچہ سارا کی اپنے پرانے دوست سے محبت بھی اس تناظر میں دیکھی جا سکتی ہے مگر اس کا بامعنی مطالعہ صوفیہ اور طالب کے کرداروں میں بہتر طور پر کیا جا سکتا ہے۔ جنگ جوئی اور افغانوں کا وہ قدیم الایام تعلق جس کا ایک زمانے (نوے کی دہائی) میں امریکی سامراج بیک وقت خالق بھی تھا اور بہت مداح بھی، طالب کی شخصیت کی بنیادی کلید ہے اور اس کے ماموں (حبیب اللہ) کے غیر مہذب رویے اور افعال کو بھی اسی تناظر میں دیکھا جا سکتا ہے۔ نسلی خصائص کی بنیاد پر متن اور لکھاری کا مطالعہ مابعد نوآبادیاتی تنقید کا مرغوب موضوع ہے، لیکن بہ انداز دگر، ضروری نہیں کہ ہر تنقیدی

رجحان کے مہیّا کردہ تنقیدی اوضاع ہر حال میں درست فیصلے کی طرف ہی لے جائیں۔ قومیت اور نسل پر افتخار اہم یا اعلیٰ بات ہوسکتی ہے لیکن ان ممنوعات کا معروضی تجزیہ آپ کو صرف تاریخ کے سیاق میں ہی زندہ رکھتا ہے، حال میں زندہ رہنے کے لئے خود احتسابی یا زیادہ بہتر یہ ہے کہ خود تنقیدی کا رویہ زیادہ بامعنی ہوتا ہے۔

د) کسی قدیم قبائلی سماج میں عورتوں کی حالت زار کو سمجھنے کی خاطر ادب کا موضوع بنانا ترقی پسند تحریک کے زمانے سے زیادہ اہمیت کا حامل رہا ہے۔ اس ناول کے اندر بھی یہ ایک اہم مسئلے کے طور پر زیر بحث ہے۔ مابعد جدید تنقید کے دائرے میں ردنوآبادیاتی رجحان اور تانیثیت دونوں ہی اس صورت حال کی تفہیم کے نئے پیمانے وضع کرتے نظر آتے ہیں۔ مابعد جدید ناقدین اس امر پر متفق ہیں کہ ادب سماج کا زائیدہ ہوتا ہے مگر یہ (ادب) سماج کا زائیدہ ہوتے ہوئے بھی اس کی کئی وضعوں کو منہدم (Subvert) کرنے کا فرض بھی سلیقے سے نبھاتا ہے۔ اس ناول میں یہ صورت حال بہت واضح طور پر ایک اکراہی اور انہدامی کیفیت میں ڈھلتی نظر آتی ہے۔

پھر یہ ماموں بھانجے کا معمول بن گیا۔ طالب روزانہ صبح صبح بلند آواز سے اذان دیتا اس کے بعد حبیب اللہ کے ساتھ باجماعت نماز پڑھتا، دونوں اونچی آواز میں تلاوت کرتے۔ نماز کے فوراً بعد اکٹھے ناشتہ کرتے اور صبح صبح گھر سے نکل جاتے۔ طالب صوفیہ کو یہ بتانے کی زحمت بھی گوارا نہ کرتا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں اور کب تک لوٹیں گے۔ شام کو دیر سے واپس لوٹتے۔ صوفیہ ناشتہ اکیلے ہی کرتی۔ کام سے واپس آ کر وہ کھانا بناتی، کبھی کبھی تو برتن میز پر لگا رہی ہوتی کہ دونوں آ کر میز پر بیٹھ جاتے اور ابھی پوری طرح سامان میز پر رکھا بھی نہ ہوتا کہ حبیب اللہ بسم اللہ پڑھ کر کھانا شروع کر دیتا اور طالب بھی اس کا ساتھ دیتا، جب تک وہ آ کر کھانے کی میز پر بیٹھتی وہ کھانا ختم بھی کر چکے ہوتے۔ اور صوفیہ بمشکل ہی نوالے حلق سے نیچے اتار پاتی۔ وہ خود کو بہت بے بس محسوس کرنے لگی تھی۔ (ص ۱۶۰)

ایک بات البتہ اس ناول میں ایسی ہے کہ جس سے قاری اشتباہ میں پڑ سکتا ہے اور وہ عافیہ صدیقی کے بارے میں بیانیہ کا حصّہ ہے لیکن یہاں بھی مابعد جدید تنقید مصنفہ کی حمایت کر سکتی ہے کہ یہ فاضل مصنفہ کا نقطہ نظر نہیں بلکہ یہ سادہ لوحی پر مبنی وہ اجتماعی شعور ہے جو ایک جذباتی ذہنی رویوں کے اسیر سماج میں نوائے وقت جیسے اخبار ماضی میں اور میڈیا (خاص طور پر الیکٹرانک میڈیا) کا ایک معتد بہ حصہ آج بھی پیدا کر رہا ہے۔ آج پاکستان میں صرف یہ کہنا بھی دشوار ہے کہ ڈاکٹر عافیہ صدیقی امریکی شہری تھیں چہ جائیکہ ان کی طالبان کے لئے کھلی ہمدردی کو زیر بحث لانا۔

یہ ناول پڑھتے ہوئے ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کی بات بار بار یاد آتی ہے کہ کسی فن پارے کے امتحان کے لئے صرف ادبی معیارات ہی کافی نہیں ہوتے یا تمام تر فن پارے محض ادبی بنیادوں پر تحسین کے عمل سے نہیں گزارے جا سکتے۔ بعض اوقات بعض فن پاروں کی تحسین کے لئے غیر ادبی معیارات ادبی معیارات سے زیادہ اہم ہو جاتے ہیں۔ ایلیٹ کی یہ بات مابعد جدید ناقدین سے زیادہ قدیم الایام جدیدیت والوں کے یاد رکھنے کی ہے۔

حواشی:

۱۔ فرانسس فوکویاما نے پہلے اپنے ایک مضمون اور بعد میں اپنی کتاب End of History and the Past man میں سوویت یونین کے تحلیل ہونے کے بعد دنیا کو یک قطبی قرار دیا۔

۲۔ Terry Eaglton, Holy Terror, Oxford University Press, London, 2005

۳۔ اس حوالے سے دیکھئے درج ذیل کتب:

i- Ralph H. Magnus & Edan Nabi, Afghanistan: Mullah Marx and Mujhaid, West View Press, Oxford, 1998

ii- Gohari, H.J. The Taliban, Ascent to power, Oxford University Press, Karachi, 1999

iii- Amir Mir, The Fluttering Flag of Jehal, Mashaal Publishers, Lahore, 2008

iv- Jean, Charlis Brizard & Guillaume Dosquie, Forbidden Truth, Nation Books, New York, 2002

v۔ احمد رشید، طالبان، (لاہور: مشعل بکس، ۲۰۰۰ء)

۴۔ منان طاہر، ''یہ جہاد''، (لاہور: نیاز مانہ پبلی کیشنز، ۲۰۱۰ء)

مآخذ:

۱۔ احمد رشید، طالبان، لاہور: مشعل بکس، ۲۰۰۰ء۔

۲۔ منان طاہر، ''یہ جہاد''، لاہور: نیاز مانہ پبلی کیشنز، ۲۰۱۰ء۔

۳۔ Amir Mir, *The Fluttering Flag of Jehal*, Mashaal Publishers, Lahore, 2008.

۴۔ Gohari, H.J. *The Taliban, Ascent to power*, Oxford University Press, Karachi, 1999.

۵۔ Ralph H. Magnus & Edan Nabi, *Afghanistan: Mullah Marx and Mujhaid*, West View Press, Oxford, 1998.